زندہ سوالات

معیار فلاح ونجات

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

آج کل یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ انسان کے لئے فلاح و نجات کے لئے بس یہ کافی ہے کہ وہ عملی حیثیت سے اچھا آدمی ہو، مثلاً جھوٹ نہ بولتا ہو، دیانتدار ہو، خیانت نہ کرتا ہو، انصاف پسند ہو، ظلم وتعدی سے پرہیز کرتا ہو، امن پسند ہو، فتنہ وفساد سے علیحدہ رہتا ہو۔ یہ سب اچھے اوصاف جس میں ہوں وہ نجات کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ کسی عقیدہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ کو ایک مانو، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا رسول سمجھو، آخرت کو تسلیم کرو، قیامت کا یقین کرو، غرض کہ دین کے ساتھ جو ایک دنیا معتقدات کی وابستہ کر دی گئی ہے، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ خیال اگر قرآن اور حدیث سے بالکل بیگانہ اشخاص کی طرف سے پیش ہوتا تو اس پر بحث دوسری طرح ہونا چاہئے تھی مگر چوں کہ یہ خیال کچھ مذہبی حلقوں میں بھی پایا جاتا ہے، اس لئے اس پر بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے قرآن سے فیصلہ طلب کرنا مناسب ہوگا۔ جب ہم قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ قرآن نجات کے لئے ایمان اور عمل صالح دونوں کی ضرورت بتلاتا ہے۔

علاوہ ان کثیر التعداد آیتوں کے جہاں مجمل طور پر نعیم اخروی کے وعدوں میں ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ کافی تفصیل سے کام لیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (بقرہ ۱۷۷)

اس کا واضح خلاصہ یہی ہے کہ نیک آدمی ہونا صرف کسی ایک طرح کے عمل سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اللہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان ہو اور پھر عمل صالح ہو جس کی ایک فہرست پیش کر دی ہے جس میں حقوق اللہ بھی ہیں اور حقوق الناس بھی۔ اور یہ سب باتیں اَو۔ اَو کے ساتھ نہیں ہیں جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یا ایمان ہو یا خیرات ہو یا نماز ہو۔ اس صورت میں ان میں سے ایک بات اگر ہوتی تو نیک آدمی ہونے کے لئے کافی ہوتی مگر یہاں تو وہ سب باتیں وَ۔ وَ۔ وَ کے ساتھ بیان کی ہوئی ہیں جس کے معنی ہماری اردو زبان میں اور۔ اور۔ اور کے ہوتے ہیں اس کا تقاضا ہے اجتماع اوصاف۔ کہا جا رہا ہے کہ نیک آدمی ہونے کا معیار ہے اللہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان اور نماز کا قائم رکھنا اور زکوٰۃ دینا وغیرہ وغیرہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام اوصاف کو نیک ہونے میں دخل ہے۔ ان میں سے بعض ہوں اور بعض نہ ہوں تو نیکی کا مصداق حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر کوئی بڑا صاحب ایثار ہے اور دوسروں کے دکھ درد میں کام آتا ہے۔ سچ بولتا ہے، کسی کو آزار نہیں پہنچاتا مگر عقیدہ کچھ نہیں رکھتا۔ ایمان نام کی کوئی چیز اس کے دل ودماغ کے کسی گوشہ میں نہیں ہے تو قرآن کے رو سے وہ نیک آدمی نہیں ہے اور اس

حسن انجام میں بھی اس کا حصّہ نہیں ہے جس کا قرآن نے نیک آدمیوں کے لئے اعلان کیا ہے۔

اب آیئے عقلی طور پر غور کریں کہ حسن عمل کے ساتھ حسنِ اعتقاد یا ایمان کی ضرورت کیا ہے؟ اور اہمیت کس لئے ہے؟

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ افعال و اعمال انسان کے اعضاء و جوارح سے تعلق رکھتے ہیں، اور اعتقادات اس کے دماغ و ذہن سے۔

اگر انسان فاعل مختار نہ ہوتا۔ اس کے افعال بالطبع ہوتے، بالارادہ نہیں تو اس کے افعال میں نیت وضمیر کا دخل اور دماغ و ذہن سے ان کا ربط نہ ہونا ٹھیک تھا مگر انسان کا کمال تو اس کے جوہر اختیار میں مضمر ہے اور اختیار نفس سے متعلق ہے جس کی کار فرمائی ذہن ودماغ کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

بغیر کسی عقیدہ کے مشق و عادت سے عمل ہوسکتا ہے۔ جیسے ایک ماں باپ نے ابتدائے عمر سے بچے کو نماز پڑھنا سکھایا تو ماں باپ نے یہ ایک عادت ڈال دی ہے کہ ادھر صبح نمودار ہوئی اور فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ اٹھا اور نماز پڑھی۔ ظہر وعصر کا وقت ہوا اور یہ مسجد میں پہنچ گیا نماز پڑھ لی۔ اسی طرح مغرب اور عشاء کے وقت۔ یہ ماں باپ نے ایسی عادت ڈال دی ہے کہ نماز کا وقت آتے ہی یہ بےچین ہوجاتا ہے۔ جب تک نماز پڑھ نہیں لیتا طبیعت بےقرار رہتی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا اور معلوم ہوتا ہے ایک بوجھا ہے سر پر جسے اتارنا ضروری ہے لیکن اگر یہ عبادت صرف بر بنائے عادت ہے تو اس کا اثر نماز ہی کی حد تک رہے گا، اس کے دوسرے کردار پر اثر نہیں پڑے گا۔

جیسا کہ بہت سے نمازیوں میں روزمرّہ کا مشاہدہ ہے اور اسے اِس دور میں مذہب اور پابندی مذہب کے خلاف بطور اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ وہی جو نماز کا اتنا پابند ہے۔ اگر کسی کا پیسہ اس کے ذمہ واجب الادا ہو تو یہ اس کی ادائی کے لئے کسی کی امانت اس کے پاس ہو تو اس کی بحفاظت واپسی کے لئے ایسا بےچین نظر نہیں آتا، مگر درحقیقت یہ اسی وجہ سے ہے کہ اس کی عبادت عادت کا نتیجہ ہے۔ اس میں وہ روح نہیں ہے جس کا قُرْبَۃً اِلَی اللّٰہ کے الفاظ جو نیت نماز میں اس نے سیکھے ہیں تقاضا رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عادت ایسی چیز ہے جو انسان کو کسی کار خیر کا پابند بناسکتی ہے مگر مشق وعادت کا نتیجہ جزئی ہوگا۔

اسی صورت سے کسی کو ماں باپ کی تربیت یا کسی اچھے ماحول کے اثر سے سچ بولنے کی مشق ہوگئی ہے۔ یہ سچ بولنے کی عادت چوں کہ زبان سے متعلق ہے لہٰذا زبان اس کی پابند ہوجائے گی۔ مگر اسی زبان سے یہ کسی کی دل آزاری نہ کرے، اس زبان سے یہ چغلی نہ کھائے، اس زبان سے اشتعال انگیزی کرکے یہ فساد نہ کرائے، یہ سب اس مشق کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ پھر سچ بولنے کی اسے عادت ہے تو یہ اس سچ کے محل کو دیکھے اور اس کے نتائج پر غور کرے ایسا نہیں ہوگا۔ اب اگر کسی نے دوسرے کو گالیاں دیں اور اس نے اپنی سچ کی عادت کی بناء پر اس دوسرے سے بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کردیا کہ فلاں نے تم کو یہ کہا ہے تو بہت ممکن ہے یہی سچ ایک بڑی خونریزی کا سبب بن جائے۔ اسی طرح متعدد گناہان کبیرہ ہیں جو سچ ہی سے عالم وجود میں آتے ہیں۔ وہ سچ بولنے کی عادت ان گناہوں سے بچا نہیں سکتی بلکہ وہی ان گناہوں کی محرک ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ہر کام جو عادات کی بناء پر وقوع میں آئے وہ یقینا محدود حیثیت رکھے گا اور انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

حقیقتہً تمام اعضاء انسانی پر جو حکمراں ہے وہ نفس ہے۔ اعضاء کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر فعل الگ ہے اور فاعل بھی الگ الگ ہیں۔

مثلاً دیکھنا آنکھوں کا کام ہے، پیروں سے کوئی تعلق نہیں۔ چلنا پیروں کا کام ہے، کان سے کوئی تعلق نہیں ------- وغیرہ وغیرہ۔ مگر یہ تمام افعال نفس کی منزل میں جا کر سمٹ جاتے ہیں۔

دیکھا آنکھوں نے مگر یہ شخص کہے گا میں نے دیکھا۔ سنا

کانوں نے، وہ کہے گا میں نے سنا۔ اٹھایا ہاتھ نے مگر وہ کہے گا میں نے اٹھایا۔

معلوم ہوا کہ نفس انسان وہ ہے جو تمام اعضاء پر حاوی ہے۔ اب اگر کوئی چیز نفس پر اپنا اثر قائم کردے تو اس کے بعد اعضاء کو الگ الگ مشق کرانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہی نفس کا تاثر تمام اعضاء کو پابند بنادے گا۔ اعتقاد و ایمان وہی چیز ہے جو براہ راست نفس پر اپنا سکہ جماتا ہے۔ اور جب ایمان نے نفس کو مسخر بنالیا تو ایک سانچہ کردار کا بن گیا جس میں ڈھل کر تمام افعال ضبط و نظام کی پابندی کے ساتھ، بلند مقاصد کے تحفّظ کی نگہداشت کے ساتھ ہوں گے۔ اس سانچے کا نام قرآنی اصطلاح میں ''تقویٰ'' ہے اور وہ بغیر ایمان وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔

حقیقت امر یہ ہے کہ بغیر اعتقاد کے عمل کے لئے کوئی پس منظر مہیّا نہیں ہوتا جیسے عمارت ہو اور اس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ درخت ہو اور اس کی جڑیں نہ ہوں۔

عقائد اور اعمال کے لئے اصولِ دین اور فروع دین کی اصطلاح اسی حقیقت کی مظہر ہے جس طرح درخت کی جڑیں اندر اندر پھیلتی ہیں، اور شاخیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔

اسی طرح اعتقادات دل و دماغ کے اندر جگہ پکڑتے ہیں اور ان کا اثر اعضائے جسم سے افعال کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

اب اگر شاخیں نظر نہ آئیں تو یقین کرنا چاہئے کہ اصل کمزور ہے کیوں کہ اگر اصل طاقتور ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ شاخیں نمایاں نہ ہوں۔

جب شاخیں مفقود ہیں یا ہیں تو لیکن خشک ہیں تو ان شاخوں کے ہرا کرنے کے لئے شاخوں کو پانی سے بھگویا نہیں جائے گا بلکہ جڑ کو پانی دیں گے۔ اسی سے شاخیں تر و تازہ ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح ہم میں اگر عملی کمزوریاں ہیں تو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ہمارا ایمان مستحکم ہے بلکہ یہ درحقیقت عقائد ہی کی کمزوری ہے جو اعمال میں کوتاہی کی باعث ہے۔

اسی طرح اگر اصل موجود نہ ہو اور صرف شاخیں تر و تازہ نظر آئیں تو یہ شاخیں یقیناً نمائشی ہوں گی۔ وہ اس درخت کی شاخیں ہی نہ ہوں گی۔ نہ وہ مستحکم ثابت ہوسکتی ہیں۔ جب تک کسی تیز آندھی کا جھوکا نہیں آتا۔ یہ شاخیں قائم ہیں اور ادھر کوئی تیز آندھی چل گئی، انقلاب کا کوئی طوفان آگیا اور بس یہ شاخیں غائب ہوگئیں۔

ان نمائشی شاخوں سے رونق چمن ہوسکتی ہے اور ایک محدود وقت تک ان کا سایہ باعث آرام بھی ہوسکتا ہے مگر ان شاخوں سے ثمر ملنا غیر ممکن ہے۔ ثمرہ ان ہی شاخوں سے حاصل ہوسکے گا جو اصل سے متصل ہوں۔

یہی تعلق عقائد و اعمال کا باہمی ہے۔ اگر اعمال نہیں ہیں تو ایمان یا تو ہے ہی نہیں اور یا ہے تو اتنا کمزور کہ حیات میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کرسکتا اور اعمال اگر بغیر صحیح عقائد کے ہیں تو وہ وقتی ہیں۔ ان میں کوئی پائداری نہیں اور ان سے ثمرۂ نجات حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ اعمال یا بطور عادت ہیں یا کسی حکمت عملی سے بطور نمائش ہیں۔ لہٰذا ان پر اعمال صالحہ کا اطلاق بھی واقعۃً درست نہیں ہے۔

ہاں اگر ایمان ہو اور کردار اس کے مطابق ہو تو وہ اس شخص کے لئے بھی نتیجہ خیز ہے اور دوسروں پر بھی اثر انداز۔

ایمان تو دل کے اندر کی چیز ہے وہ بذات خود دوسروں کو متأثر نہیں بنا سکتا۔

جذابیت تو ان ہی افعال و اعمال سے ہوتی ہے جو اس ایمان کے نتائج و آثار ہیں۔

حق کے پرستاروں میں یہ جوہر موجود ہو تو زبان سے تبلیغ کی زیادہ ضرورت نہیں، صحیح کردار ہی بہترین مبلغ ہوسکتا ہے۔

مگر یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب حسن عمل ہو اور اس کے پس پشت صحیح اعتقاد اور ایمان کی قوت موجود ہو۔

اسی لئے قرآن مجید نے ہر جگہ اپنی بشارت کو ایمان اور عمل صالح دونوں کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔

✿✿✿